

معین الدین عقیل \*

## اردو زبان و ادب پر گارسیں نقاسی کے احسانات: اولین تاریخ ادب اردو

جنوبی ایشیا میں ادب اور بالخصوص اردو زبان و ادب کی تاریخ نویسی نوآبادیاتی دور کا شمر ہے جب جدید علوم کے اثرات سے ہمارے معاشرہ فیض پانے کے قائل ہو رہا تھا اور زبان اور ادب کی نوعیت اور اس کے معیار کا تعین بھی معاشرے کے محرکات اور تقاضوں کے مطابق کیا جانے لگا تھا۔ تاریخ نویسی کا عمل قبل ازیں محض سیاسی واقعات کو محفوظ کرنے یا ترتیب دینے یا اکابر کی سوانحیات تحریر کرنے تک محدود تھا۔ اس عمل میں مملکتوں اور حکمرانوں کے احوال تو ہماری روایتی تاریخوں میں خوب جگہ پاتے رہے، اور اگر کچھ بہت مبسوط اور جامع تاریخیں لکھی گئیں تو ان میں سیاسی مدبروں، دانش وروں، اور علما و شاعروں کے احوال بھی شامل ہوتے رہے۔ اسی عمل کے ذیل میں مذکرہ نویسی نے فروغ پایا جس میں رفتہ رفتہ تحقیق و تنقید کے عناصر بھی گاہے گاہے جگہ پاتے رہے۔ یہی عناصر بعد میں ادبی تاریخ نویسی کے عمل میں، اس کا معیار بنتے رہے ہیں۔

تاریخ، تحقیق اور تنقید کا باہمی امتزاج اور اشتراک ہمیں ابتدا میں شعرا کے معیاری تذکروں میں نظر آتا ہے جس کے زیر اثر مذکرہ نگار شعرا کا کلام منتخب کرتے رہے اور کہیں کہیں ان کی شخصیت اور ان کے ذوق و فن کی جانب اشارے بھی کرتے رہے۔ پھر ان میں گاہے تحقیقی اور تاریخی شعور بھی نظر

آتا ہے۔ ابتدائی تذکرہ نگاروں میں قائم (مخزن نکات، ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۱ء) اور میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو، ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء) وہ تذکرہ نگار تھے جنہوں نے اپنے تذکروں میں شعرا کو اس وقت کے عام رواج کے مطابق، حروف تہجی یا کسی بے ترتیبی کے بجائے محققین، متوسطین اور متاخرین (یا معاصرین) جیسے ادوار میں تقسیم کر کے اپنے نیم پختہ سے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔ قدرت اللہ شوق کا تذکرہ طبقات الشعراء (۱۱۸۹ھ/۱۷۷۷ء) اس شعور میں کچھ اضافے کا پتا دیتا ہے۔ میر حسن نے اگرچہ شاعروں کو حروف تہجی ہی کے اعتبار سے شامل کیا لیکن پھر اسی ترتیب میں انہوں نے مذکورہ طبقات وضع کیے تھے، جب کہ قائم نے حروف تہجی کے بجائے مذکورہ تاریخی ترتیب کو ملحوظ رکھا تھا۔ شوق نے کچھ آگے بڑھ کر اس ترتیب کو زمانی اور طبقاتی اور کچھ موضوعاتی لحاظ سے بھی تقسیم کیا، لیکن یہ کوشش خام سے زیادہ نہیں اور شعرا کو اس طرح طبقاتی، زمانی و تاریخی نسبت کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے کہ یہ عمل ان شعرا کے ساتھ اور ان کے عہد کے ساتھ زیادتی سے کم نہیں۔ یعنی معاصرین کو بھی انہوں نے زمانی اعتبار سے تقسیم کر دیا جو یا تو معلومات کی کمی کے باعث ہوا یا تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک تذکروں میں گلمنہن بے خاد (۱۸۳۵ء) واحد اور جامع تذکرہ ہے جس میں تذکروں کی قدیم مسلمہ روایت کے ساتھ ساتھ تنقید اور معیار کو بھی اہمیت حاصل ہوتی نظر آتی ہے۔ جو اسی روایت کے تسلسل میں کوئی نصف صدی کے بعد آب حیات میں یکجا ہو جاتی ہے، جس میں اب شعرا کے تذکرے کے ساتھ ساتھ لسانی تحقیق، ادبی تنقید اور تاریخ اور سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے بھی ملتے ہیں۔ اسی بنا پر یہی ہماری تاریخ نویسی کا آغاز ہے اور تنقیدی شعور اور تحقیقی جستجو کے باعث اب تذکرہ نگاری تاریخ نویسی میں ضم ہو جاتی ہے۔ یوں تذکرے بعد میں بھی، یعنی بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھی لکھے جاتے ہیں اور اس طرح یہ روایت یکسر ختم تو نہیں ہوتی لیکن نوعیت اور مقصد اب مختلف ہے اور اہمیت تاریخ نویسی کو حاصل ہے۔

نوآبادیاتی عہد کے دور اول (۱۸۵۷ء) تک تذکروں میں تاریخی اور تنقیدی شعور کا نسبتاً بہتر اظہار مولوی کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعراء ہند (۱۸۳۸ء) سے نظر آنے لگتا ہے، جس

کو تاریخی و تنقیدی احساس کا حامل ایک زیادہ بہتر تذکرہ کہا جاسکتا ہے اور چونکہ اس کا محرک اور اس کی بنیاد گارسن دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی تھی، جو دراصل تذکرہ بلکہ تاریخ شعرا ہی ہے اور اس وقت، جب کہ یورپ میں بھی ادب کی تاریخ دراصل شاعری ہی کی تاریخ سمجھی جاتی تھی، گارسن دتاسی کی تاریخ واقعتاً ہمارے تذکروں کی ایک زیادہ مکمل، ضخیم اور ترقی یافتہ صورت ہے اور ایک لحاظ سے ہماری تذکرہ نویسی کے دور میں ادبی تاریخ نویسی کی سب سے پہلی کوشش بھی ہے لیکن جنوبی ایشیا میں نہیں یورپ (پیرس، فرانس) میں۔

گارسن دتاسی (۱۷۹۳ء-۱۸۷۸ء) بلاشبہ انیسویں صدی کے مستشرقین میں اس اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز ہے کہ اردو تحقیق اور مطالعہ اسلام کے ضمن میں اس کے تحقیقی مطالعات نے اپنے موضوعات پر ایسا ذخیرہ ماخذ فراہم کر دیا ہے کہ جن سے استفادے کے بغیر اردو زبان و ادب اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا کوئی مطالعہ، خصوصاً انیسویں صدی کے تعلق سے، جامع اور مستند نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک کثیر التصانیف محقق و مصنف تھا اور سب کچھ فرانسیسی زبان میں لکھتا رہا اس کی محض چند کتابیں، اس کے انتقال کے کوئی نصف صدی کے بعد ہی کسی زبان میں منتقل ہونا شروع ہوئیں یا پھر ہمارے دانشوروں اور محققین و مصنفین نے اپنے ذوق و شوق اور اپنے مطالعات کے سلسلے میں جب خصوصاً فرانس میں وقت گزارا تو اردو کے تعلق سے اس کی تحقیقات سے واقفیت حاصل ہونے اور ان کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کی وجہ سے اردو زبان میں ان کے ترجموں کو ضروری سمجھا اور یوں اس کے خطبات اور تمہیدی خطبات جیسے مجموعوں کی صورت میں اس کی تحقیقات بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشروں میں اردو میں منتقل ہوئیں اور اردو محققین کے لیے اہم ماخذ ثابت ہوئیں۔ پھر یہی مجموعے قدرے ترمیم و تہجج کے ساتھ سن ساٹھ اور ستر کی دہائی میں شائع ہوئے۔

اس عمل کے دوسرے مرحلے میں اس کی بعض تصانیف کو، جو اردو زبان و ادب کے لیے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے اردو شعرا کے تذکروں پر اس کے مطالعات جنہیں اولاً فشی ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲ء-۱۹۱۰ء) نے اردو میں ترجمہ کیا اور بعد میں اسے اضافی معلومات کے ساتھ ڈاکٹر تنویر احمد علوی (پ: ۱۹۲۵ء) نے مرتب و شائع کیا اسی کام کو ڈاکٹر ریاض الحسن (۱۹۰۲ء-۱۹۸۲ء) نے بھی انجام

دیا۔ یہ سب ہوا لیکن افسوس کہ اردو تحقیق کے ضمن میں دتاسی کی سب سے اہم تصنیف اس کی تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی (Hindoustanie)، جو اولاً ۱۸۳۹ء میں، اور پھر ۱۸۳۷ء میں (بطور جلد دوم) اور بعد میں بہت قیمتی و تازہ اضافوں کے ساتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی، لیکن اپنی اشاعت کے ۹۰ سال گزرنے اور اردو زبان و ادب کا انتہائی ناگزیر ماخذ ہونے کے باوجود نہ انگریزی میں اور نہ اردو میں ترجمہ ہو کر منظر عام پر آئی، جب کہ دتاسی کی مذکورہ تصنیف (مذکرہ شعرا) سے قطع نظر اس کے سارے ہی خطبات کو مذکورہ بالا صورتوں میں مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) نے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد کے تحت اہتمام سے ترجمہ کروا کے شائع کروا دیا تھا۔ اسی طرح کا اہتمام اس موقع تصنیف کے لیے بھی ضروری تھا۔ بہر حال اس کا ترجمہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء-۱۹۹۳ء) کی مرضی سے شعبہ اردو، جامعہ کراچی کے تحت ۱۹۶۰ء میں ایک فرانسیسی خاتون لیلیان سیکستین مازو نے راست فرانسیسی زبان سے اردو میں کیا، جس کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن پھر بھی مزید نصف صدی گزر جانے کے باوجود یہ ترجمہ نا حال شائع نہ ہوا۔

یہ ترجمہ پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے مقصد سے امتحان کے رسمی تقاضوں کے مطابق کراچی یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔ مترجمہ فرانسیسی تھیں۔ نامور محقق اور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۹ء-۲۰۰۲ء) کی وجہ سے، جو ایک عرصے سے پیرس میں مقیم تھے، ان میں اردو زبان سے رغبت پیدا ہوئی اور انھوں نے اردو سیکھی اور پیرس کی سو بورن یونیورسٹی اور ادارہ السہ شرقیہ سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ روایت ہے کہ وہ وہاں سفارت خانہ پاکستان میں ملازمت کے باعث یا کسی اور حیثیت میں وابستہ تھیں۔ پھر پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی (۱۸۹۳ء-۱۹۶۳ء) کی وساطت سے تعلیمی وظیفے پر یہ پاکستان آئیں اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے، بغرض حصول سند پی ایچ ڈی، منسلک ہو کر یہ کام کیا، جس کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔ مجلس اعلیٰ تعلیم و تحقیق، (Board of Advance Studies and Research)، جامعہ کراچی کے اجلاس، مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۶۰ء میں قرارداد نمبر ۱۰ کے تحت اس خاتون کا داخلہ پی ایچ ڈی میں اس ساہقہ تاریخ سے منظور ہوا،

جب اس خاتون نے ڈاکٹریٹ صاحب کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ مقالے کے ممتحن ڈاکٹر یوسف حسن خاں (پروفیسر، کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر عزیز احمد (لندن، معروف ناول و افسانہ نگار اور محقق) اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مقرر ہوئے۔ زبانی امتحان کے لیے ڈاکٹر یوسف حسن خاں اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا نام تجویز ہوا تھا لیکن کسی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسن خاں کی معذرت کے سبب ان کی جگہ ایف اے کریم فضلی ممتحن نامزد ہوئے۔ ان ممتحنین کی سفارش کے نتیجے میں مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں اس خاتون کو کامیاب قرار دے کر پی ایچ ڈی کی سند دینا منظور کر لیا گیا۔

بظاہر محض کسی کتاب کا ترجمہ اس سند کے لیے قابل قبول نہ ہو سکتا تھا اس لیے مترجمہ نے ترجمے میں مصنف کے بیانات کی تصدیق و توثیق کے لیے ہم عصر ماخذ سے، جن کے حوالے خود مصنف نے متن میں دیے تھے، اسناد پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مصنف نے جن مقامات پر معلومات تشہد چھوڑ دی تھیں کہیں کہیں وہاں متعلقہ معلومات کو حاشی میں تحریر کیا ہے یا جن شعرا کے اشعار کا حوالہ مصنف نے دیا تھا یا ان کے ترجمے فرانسیسی میں کیے تھے، لیکن اشعار نقل نہیں کیے تھے، مترجمہ نے متعلقہ ماخذ سے ایسے متعدد اشعار کو اخذ کر کے متن ہی میں انھیں شامل کر دیا ہے یا اگر وہ اشعار دستیاب نہ ہوئے تو وہاں معذوری ظاہر کر دی ہے۔ جہاں کہیں ضروری محسوس ہوا وہاں نثری عبارتیں بھی نقل کی ہیں۔ یہ سب مترجمہ کے کیے ہوئے ایسے اضافے ہیں جو اصل فرانسیسی متن میں موجود نہیں۔

مترجمہ نے اپنی جانب سے ایک اور مزید کوشش یہ کی ہے کہ اپنے تحریر کردہ 'تعارف' کے آخر میں ان ماخذ کی ایک فہرست بھی درج کر دی ہے جنھیں مصنف نے پیش نظر رکھ کر یہ کتاب تصنیف کی تھی۔ اس فہرست میں دیکھا جاسکتا ہے کہ مترجمہ نے ان ماخذ کی وہ اشاعتیں درج کی ہیں جو اس کے اپنے پیش نظر ہیں، جب کہ مصنف کے سامنے تو ان میں سے اکثر ماخذ اس وقت تک غیر مطبوعہ تھے۔ مترجمہ نے جہاں متن یا حاشی میں مغربی نام تحریر کیے ہیں وہاں انھیں اردو میں لکھنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن متعدد مقامات پر نام رومن ہی میں رہنے دیے ہیں اس کی ایک وجہ بظاہر ان ناموں کا تلفظ بھی ہو سکتا ہے جن کو اردو میں لکھنا مترجمہ کے لیے ممکن نہ رہا ہوگا۔ مترجمہ نے گارساں دتاسی کے نام کا املا 'گارساں دتاسی' کیا ہے لیکن ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۱۹۰۹ء-۲۰۰۲ء) نے، جو فرانسیسی

زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، ’گارساں‘ کے لیے ’گارسیں‘ تلفظ پر اصرار کیا ہے، اس لیے جہاں جہاں مصنف کے نام کو راقم نے تحریر کیا ہے وہاں ’گارسیں‘ لکھنے کو ترجیح دی ہے۔

اس ترجمے کا جو مسودہ دستیاب ہے، اس میں جگہ جگہ ڈاکٹر ابو الیث صدیقی مرحوم کے قلم سے اضافے اور تصحیحات موجود ہیں۔ اگرچہ مترجمہ لیلیان نازو ہیں لیکن اکثر مقامات پر بالمحاورہ زبان، روزمرہ تراکیب اور زبان کے فطری لب و لہجے کو دیکھ کر گمان غالب ہوتا ہے کہ زبان و بیان ہر جگہ مترجمہ کا نہیں، ڈاکٹر ابو الیث صدیقی کا قلم صاف جھلکتا ہے اور اکثر مقامات پر یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ زبان یا اسلوب مترجمہ کا نہیں ہو سکتا۔ متعدد مقامات ایسے بھی دیکھے جاسکتے ہیں کہ جہاں زبان کسی غیر اہل زبان کی ہو نہیں سکتی۔ پھر ایک اور امر بھی قابل مشاہدہ ہے کہ زبان اور اسلوب ہر جگہ یکساں نہیں، کہیں کہیں گمان گذرتا ہے، اور حقیقت سے قریب بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا ترجمہ اور اس کا اسلوب و بیان محض مترجمہ کے نہیں اور کسی ایک نہیں بلکہ کم از کم دو افراد کی کوششوں پر منحصر ہیں۔ پھر حواشی اور ’’تنقید بر جامعہ مصنف‘‘ کے ذیل میں کچھ ایسی ادبی معلومات بھی ترجمے میں شامل ہیں جن کے بارے میں بھی یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ایسی معلومات کا پیش کرنا کسی غیر زبان کے اس سطح کے کسی فرد کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ معلومات اردو ادب کے نہایت گہرے اور وسیع مطالعے کا ثمر ہو سکتی ہیں۔

اس تصنیف اور اس ترجمے سے قطع نظر اس کا مصنف ہمارے لیے اس اعتبار سے اہم اور قابل ستائش ہے کہ اس کا نام ایسے مستشرقین میں شامل ہے جو جنوبی ایشیا کبھی نہ آئے لیکن اپنے ملک میں رہ کر اردو زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق میں جتنو اور انہماک، مستقل مزاجی اور محنت و لگن کا ثبوت دیا، ان میں فرانس کے گارساں دتاسی<sup>۱</sup> کا نام، خصوصاً انیسویں صدی کے مستشرقین میں، سب سے مختلف اور نمایاں کہا جاسکتا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب اردو زبان علمی زبانوں کی صف میں ابھی شامل نہ ہوئی تھی، نہ اس کی معیاری لغات اور قواعد مرتب ہوئی تھیں، نہ یہ تدریسی زبان بنی تھی اور نہ علمی ذریعہ اظہار کے قابل سمجھی گئی تھی، نہ اس کی تاریخ کے ارتقائی مدارج اور مراحل کو سمجھنے کا کوئی واضح شعور موجود تھا، نہ ہی اس کے ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا کسی کو احساس رہا، ایسے وقت میں گارساں دتاسی اس زبان کے مطالعہ و تحقیق کی جانب اس طرح متوجہ ہوتا ہے کہ اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کر دیتا

ہے۔ وہ اس زبان کی روز افزوں مقبولیت اور ترقی کا اندازہ لگا کر اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا ہے اور اس زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دیکھنے کا آرزو مند رہتا ہے۔<sup>۲</sup>

اس کی شخصیت، حالات زندگی، اس کے علمی انہماک، اس کی اردو خدمات اور اس کی تصانیف و تالیف کے جائزے و مطالعے پر مشتمل متعدد کوششیں اردو زبان میں منظر عام پر آچکی ہیں۔<sup>۳</sup> مثلاً مذکورہ موضوعات پر درج ذیل نامزد مبسوط معلومات فراہم کرتے ہیں:

۱۔ محی الدین قادری زور، گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بھی خواہان اردو (حیدرآباد، ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۷ء)۔

۲۔ ثریا حسین، گارساں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے (لکھنؤ، ۱۹۸۳ء)۔

۳۔ قاضی عبدالودود، گارساں دتاسی (پٹنہ، ۱۹۹۵ء)۔

ان مبسوط مطالعات کے علاوہ، جن میں سے آخر الذکر مختلف وقتوں میں لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، دیگر نامزد میں سے درج ذیل مقدمات، پیش لفظ، مقالات اور کتابیں بھی قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں:

۱۔ عبدالحق، ’’مقدمہ‘‘ مشمولہ خطبات گارساں دتاسی (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، اشاعت دوم، کراچی، ۱۹۶۴ء)۔

۲۔ محمد حمید اللہ، ’’اختتامیہ‘‘ مشمولہ مقالات گارساں دتاسی جلد اول (کراچی، ۱۹۶۴ء)۔

۳۔ آغاز افتخار حسین، یورپ میں تحقیقی مطالعے (لاہور، ۱۹۶۷ء)۔

۴۔ آغاز افتخار حسین، یورپ میں اردو (لاہور، ۱۹۶۸ء)۔

۵۔ تنویر احمد علوی، ’’مقدمہ‘‘ مشمولہ رسالہ تذکرات مصنف گارساں دتاسی، مترجم مولوی ذکاء اللہ دہلوی (دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

۶۔ رضیہ نور محمد، اردو زبان و ادب میں مشتمل مشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (لاہور، ۱۹۸۵ء)۔

۷۔ سلطان محمود حسین، تعلیقات خطبات گارساں دتاسی (لاہور، ۱۹۸۷ء)۔

۸۔ ”تعلیقات خطبات گارساں دتاسی“ تہرانی مقالہ، معین الدین عقیل، مشمولہ اردو تحقیق:

صورت حال اور تقاضے (اسلام آباد، ۲۰۰۸ء)۔

گارساں دتاسی کی ان تصانیف پر، جن کا تعلق اردو زبان و ادب سے ہے، مفصل معلومات ثریا حسین نے اپنے مذکورہ بالا مبسوط مقالے میں یکجا کر دی ہیں اور اس کی تمام تصانیف و تالیفات کی ایک جامع فہرست بھی اپنے مقالے کے آخر میں شامل کر دی ہے، جن کی مجموعی تعداد ۱۵۵ ہے۔ ان سے قطع نظر گارساں دتاسی کی جو تصانیف اردو میں ترجمہ ہوئیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ تذکرہ طبقات الشعراء ہند مولفہ مولوی کریم الدین پانی پتی (دہلی، ۱۸۴۷ء)؛ دتاسی کی تصنیف تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی (Hindouie et Hindoustanie) (پیرس، ۱۸۳۹ء) سے ماخوذ معلومات پر مشتمل، جن کو فرانسیسی سے ایف فیلن (F. Fallon) نے انگریزی میں اور مولوی کریم الدین نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔<sup>۲</sup>

۲۔ تذکرات گارساں دتاسی ترجمہ: مولوی ذکا اللہ دہلوی (دہلی، ۱۸۵۳ء)؛ اس کتاب کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ (رسالہ تذکرات، دہلی، ۱۹۶۸ء)۔

۳۔ تذکرہ مختصر احوال مصنفین ہندی مولوی ذکا اللہ دہلوی نے اصل تصنیف (Les Auteurs Hindoustanis et Leurs Ouvrages) (پیرس، ۱۸۵۵ء) سے اردو میں ترجمہ کیا (دہلی، ۱۸۵۵ء)؛ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن گارساں دتاسی نے (Les Auteurs Hindoustanis et Leurs Ouvrages d'apres les Biographies Originales) کے نام سے مرتب کیا، تو اس کے ایک جز کا ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے اردو کے تذکرے کے عنوان سے شائع کیا۔ مشمولہ اردو کراچی (جنوری، ۱۹۵۰ء)۔

۴۔ خطبات گارساں دتاسی، مذکورہ بالا۔

۵۔ مقالات گارساں دتاسی، پتھج ڈاکٹر محمد حمید اللہ (کراچی، ۱۹۷۵ء)۔

۶۔ تمہیدی خطبے، پتھج ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (دہلی، ۱۹۴۱ء)۔

گارساں دتاسی نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے جو کام کیے، انھیں ان درج ذیل اقسام کے تحت دیکھا جاسکتا ہے:

۱۔ فرانسیسی زبان میں اردو زبان و ادب سے متعلق تحریریں،

۲۔ اصل اردو متون کی ترتیب و تدوین، اور

۳۔ اردو کتابوں اور تحریروں کے تراجم، فرانسیسی زبان میں۔

یہاں اس جائزے میں ۲ اور ۳ سے ہمیں غرض نہیں۔ فرانسیسی میں گارساں دتاسی نے اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں یا مقالات تحریر کیے، ان میں معلومات کی فراوانی کے لحاظ سے اس کے وہ خطبات اہم ہیں جو وہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۷ء تک ہر سال دیا کرتا تھا اور جو اردو میں خطبات گارساں دتاسی کے عنوان سے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد سے ۱۹۳۵ء میں، مقالات گارساں دتاسی کے نام سے دہلی سے ۱۹۳۳ء میں اور پھر کراچی سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئے۔ پھر تمہیدی خطبات کے نام سے بھی اس کے ابتدائی سالوں کے خطبات دہلی سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے۔ ان سب سے قطع نظر تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی (Hindouie et Hindoustanie) اس کا سب سے اہم کا نامہ ہے۔ اس نے یہ تاریخ ۱۸۳۹ء میں مکمل کی، لیکن وہ اس حد تک اس کے لیے مواد جمع کر چکا تھا کہ وہ سارا دستیاب شدہ مواد اس جلد میں سمیٹ نہ سکا، چنانچہ اس نے جب اس کتاب کو اشاعت کے لیے دیا تو اسے جلد اول قرار دینا مناسب سمجھا اور پھر مزید مواد کی فراہمی و ترتیب میں مصروف رہا۔ پہلی جلد کے اختتام تک مزید حاصل شدہ مواد اور پھر بعد میں موصولہ مواد کو ترتیب دے کر اسے اس نے دوسری جلد کے طور پر ۱۸۴۷ء میں شائع کر دیا۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا، وہ مسلسل مواد جمع کرتا رہا اور اسے اپنے خطبات کی صورت میں ہر سال مرتب اور پیش کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی تاریخ کی کسی اگلی جلد یا جلدوں کی اشاعت سے بہتر یہی سمجھا کہ کل دستیاب مواد کو اب ایک مزید ضخیم تاریخ کے طور پر مرتب کرنا چاہیے۔ اس طرح اس کی یہ تاریخ ۲۳ سال کے بعد تین جلدوں میں شائع ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ اس کی پہلی اور دوسری

جلد ۱۸ء میں اور تیسری ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔

اس تاریخ کی اولین اشاعت کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں پیرس سے مجلس تراجم شرقیہ برطانیہ عظمیٰ و آئر لینڈ Oriental Translation Committee, Great Britain and Ireland کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ اس پہلی جلد کا ذیلی عنوان سوانحات اور کتابیات (Biographie et Bibliographie) سرورق پر تحریر تھا، جس سے اس جلد کے موضوع اور مندرجات کی وضاحت ہوتی ہے۔ گارسیں دتاسی نے اس کا انتساب مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۳۹ء کو تحریر کیا تھا، جو مملکت برطانیہ کے نام تھا۔ پھر اس کا پیش لفظ تحریر کیا ہے، جو ۱۶ صفحات پر محیط ہے۔ اس پیش لفظ کے اہم مطالب کا خلاصہ قاضی عبدالودود نے اردو میں تحریر کیا تھا۔<sup>۵</sup> اس کے بعد شاعروں و مصنفین کا تذکرہ ہے جو رومن حروف تہجی میں A سے Z تک ہے۔ یہ متن کل ۵۵۴ صفحات پر مشتمل ہے، پھر ضمیمہ ہے جو تذکروں کے تعارف اور کتابیات پر مشتمل ہے اور یہ صفحہ ۵۵۵ سے ۶۰۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد اشاریہ ہے جو اشخاص کے لیے صفحہ ۶۰۷ سے ۶۱۷ تک اور اسمائے کتب کے لیے ۶۱۸ سے ۶۳۰ تک محیط ہے۔ اس آخری صفحہ پر فرانسیسی زبان میں ”پہلی جلد کا اختتام“ تحریر ہے۔<sup>۶</sup>

دوسری جلد اسی عنوان سے ۱۸۴۷ء میں مجلس مذکورہ کے اہتمام سے پیرس سے شائع ہوئی۔ یہ کل ۶۰۸ صفحات پر مشتمل تھی۔ سرورق کی پشت یا صفحہ ۲ پر ایک عبارت فرانسیسی میں تحریر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کتاب ایسٹ انڈیا کمپنی (۷۰- لیڈن ہال اسٹریٹ، لندن) کی اجازت سے سرکاری مطبع پیرس سے شائع کی جارہی ہے۔ سرورق کے بعد ۲۰۲ صفحات پر مشتمل پیش لفظ ہے جس میں گارسیں دتاسی نے ہندی اور اردو شاعری کی اصناف کا تعارف حروف تہجی کی ترتیب سے تحریر کیا ہے اور پھر صنائع و بدائع اور ادبی اصطلاحات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے کا ترجمہ بھی قاضی عبدالودود نے مذکورہ مقالے میں جلد اول کے مقدمے کے بعد شامل کیا۔<sup>۷</sup> متن کا آغاز صفحہ ۱ سے کیا گیا ہے اور یہ اقتباس اور ان کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ سرورق پر اس جلد کا موضوع ذیلی عنوان کے طور پر تحریر کر دیا گیا ہے: *Extraits et Analyses*۔ متن کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے اقتباس نقل کیا گیا ہے پھر اقتباس سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یوں یہ متن صفحہ ۶۰۴ پر مکمل ہوتا ہے۔ صفحہ

۶۰۵ سے ۶۰۸ تک فہرست مندرجات ہے۔

اس تصنیف کا دوسرا ایڈیشن خاصے اضافوں کے ساتھ ایشیا ٹیک سوسائٹی، پیرس کے زیر اہتمام تین جلدوں میں شائع ہوا۔ سرورق پر ”دوسری اشاعت“ کے ساتھ تحریر ہے کہ ”نظر ثانی، تصحیح اور خاصے اضافوں کے ساتھ“۔ پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، جو پیش لفظ کے ۱۴ اور متن کے ۶۲۴ صفحات پر مشتمل تھی۔ متن میں ۷۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے اردو زبان اور اس کے اسالیب اور اس کتاب کے مآخذ کا تعارف تحریر کیا ہے اور ذیل میں ادبی اصناف اور اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور پھر تذکروں کا تعارف کرایا ہے، جو اس کتاب کے مآخذ کی حیثیت میں اس کے پیش نظر رہے۔ یہ تذکرے تعداد میں ۶۶ تھے۔ متن کا وہ حصہ جو صفحہ ۷۳ سے شروع ہوتا ہے، شعرا و مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے اور حروف تہجی کی ترتیب میں مولوی مظہر علی حضوری کے ترجمے پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں صفحہ ۶۱۹ سے ۶۲۴ تک محمد عاجز کے قصۂ لعل و گہوہر پر وضاحتی و تنقیدی شذرہ تحریر کیا ہے، جس کا ذکر اس نے صفحہ ۶۱۸-۶۱۹ پر متن میں کیا تھا۔ اس طرح یہ جلد صفحہ ۶۲۴ پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری جلد بھی ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی جو رومن حرف I اور عبارت حاجی مرزا عابد علی بیگ زائر کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حکیم سید عنایت حسین رسوا تک کا ترجمہ شامل ہے، جو صفحہ ۵۹۴ پر ہے۔ اسی صفحہ سے مستعان شاہ مداری اور الہی بخش نشاۃ کے ذیل میں ان کی مذکور مشنویوں پر اضافی معلومات درج کی ہیں، جو صفحہ ۶۰۸ تک محیط ہیں۔

تیسری جلد ایک سال کے بعد ۱۸۷۱ء میں اسی اہتمام اور تسلسل میں شائع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک استدراک سے ہوتا ہے، جو ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اسے ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو تحریر کیا۔ اس میں سابقہ دو جلدوں کے مندرجات میں حرف ”ک“ (k)، ”و“ (W) تک شروع ہونے والے مصنفین و شعرا کے تراجم مختصر شامل کیے ہیں۔ خواتین کے ناموں کی فہرست اسی ذیل کے آخر میں شامل کی گئی ہے۔

اس جلد کا متن حرف ”س“ کے اولین شاعر میر سعادت علی کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳۵۳ پر مولوی ذوالفقار علی کے ذکر پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۳۵۵ سے ۳۷۶ تک اختتامیہ

تحریر ہے، جس میں تصحیح و اضافے کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ضمیمے ہیں۔ ضمیمہ اول کتابوں کی وضاحتی فہرست پر مبنی ہے، جن کا ذکر متن میں بطور حوالہ یا استناد آیا ہے۔ یہ ضمیمہ صفحہ ۳۷۷ سے ۴۸۸ تک، ان ہی کتب حوالہ کی فہرست ہے اور اسے بھی حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ آخر میں مفصل اشاریے ہیں، جو اولاً اسمائے رجال، صفحہ ۴۸۹ سے ۵۵۰ تک اور پھر اسمائے کتب صفحہ ۵۵۱ سے آخری صفحہ ۶۰۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

گاریس دتاسی کی اسی کتاب کی دوسری اشاعت ۹۷ سال کے بعد ۱۹۶۸ء میں (فرانسیسی زبان ہی میں) نیویارک سے منظر عام پر آئی، لیکن افسوس کہ اس اہم تصنیف کا اب تک کوئی مکمل ترجمہ اردو یا انگریزی یا کسی اور زبان میں شائع نہیں ہوا<sup>۸</sup>، جو جنوبی ایشیا کے قارئین کے لیے قابل استفادہ ہوتا۔ اس کے مقدمے اور اولین صفحات کے ترجمے ضرور ہوئے، مثلاً: اس کے مقدمے کا انگریزی ترجمہ کیتاکارشن کٹی نے *Indian Literature* (دہلی: منی، جون ۱۹۸۴ء) میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصبے محل بنگالوی کے فرانسیسی میں گاریس دتاسی کے تحریر کردہ خلاصے کا بھی انگریزی میں ایک ترجمہ تھامس فلپ (Thomas Phillip) نے کیا، جو ڈبلیو اے کلوسٹن (W. A. Clouston) کی مرتبہ کتاب *A Group of Eastern Romances* میں "Rose of Bakawali" کے عنوان سے شامل ہوا۔ یہ کتاب لندن سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

افسوس یہ اہم تصنیف اپنے موضوع اور اپنی معلومات پر نہایت اہم ہونے کے باوجود ابھی تک اردو میں مکمل ترجمہ نہیں ہوئی اور جس حد تک اس کا ترجمہ ہوا وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ رہا۔ اس کے ایک انگریزی ترجمے کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ کسی شخص نے جو پاٹری جری میں مقیم تھا، اس کی ایک جلد کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، جس کا مسودہ اس نے نواب نصیر حسین خاں خیال (۱۸۸۰ء-۱۹۳۴ء) کو ملا جلتے اور اشاعت کی غرض سے بھیجا تھا۔ نواب صاحب نے یہ انگریزی ترجمہ اردو میں منتقل کرنے کے لیے محمد محفوظ الحق (۱۹۰۰ء-۱۹۳۶ء) کو دے دیا، جنہوں نے اس جلد کا ترجمہ تو نہ کیا لیکن اس کے مقدمے کا ترجمہ کر کے اسے معارف (اعظم گڑھ) میں گاریس دتاسی کے اولین تعارف کے طور پر اگست ۱۹۲۲ء میں اور پھر مقدمے کا ترجمہ ستمبر ۱۹۲۲ء کے شماروں میں شائع کیا۔

اس تصنیف کا ایک تنقیدی مطالعہ ایک فرانسیسی اسکالر Robert Ardovin نے فرانسیسی زبان میں پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کی غرض سے بعنوان *Critical study of Garcin de Tassy's Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie* تحریر کیا اور ڈپارٹمنٹ آف موڈرن یورپین لینگویج، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں پیش کر کے ۱۹۷۷ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

اس کتاب کی تصنیف کے لیے دتاسی نے جو محنت کی ہے، جس جستجو کا ثبوت دیا ہے، اور جس لگن اور مشقت سے معلومات یکجا کی ہیں، اس کتاب کے ہر صفحے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنے ذوق و شوق کے تحت اس کے لیے مواد اور معلومات حاصل کرتا رہا، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ اس نے اردو سے محبت کے ذیل میں، اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اور پھر اپنے مطالعے کو وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کرنے کے لیے علم عروض اور بیان و بدیع تک سے واقفیت حاصل کرنے کی مخلصانہ کوشش کی کہ تقطیع کے اصولوں اور بحروں سے شناسائی کا بھی وہ جا بجا ثبوت دیتا رہا ہے اور ساتھ ہی تاریخ گوئی سے اپنی واقفیت کی مثالیں بھی اس نے پیش کی ہیں۔

مصنف نے اسی ذیل میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ کون کون سی کتابیں اس نے بالمشافہ دیکھی ہیں۔ وہ اسے کس طرح حاصل ہوئیں، کس کس کے توسط سے ملیں، وہ کن کن کتب خانوں میں، قلمی یا غیر مطبوعہ، موجود ہیں اور خود اس کے ذاتی ذخیرے میں ان میں سے کون کون سی کتابیں موجود ہیں۔ اس طرح ایک فہرست کتب اس کے کتب خانے کی ایسی بن سکتی ہے جو شاید اس فہرست میں اضافہ ثابت ہو جسے قاضی عبدالودود نے تیار کیا تھا۔<sup>۹</sup> اس پر مستزاد گاریس جگہ جگہ معاصر معلومات، خصوصاً مطبوعات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے ان اخبارات کا حوالہ بھی دیتا رہا ہے جن سے اسے یہ معلومات حاصل ہوئیں۔ یہاں یہ پتا چلتا ہے کہ متعدد معاصر اخبارات بھی اس تک پہنچتے رہے جن سے اس نے راست استفادہ کیا۔ اس کے ذخیرہ کتب میں یقیناً معاصر اخبارات بھی موجود تھے جن کی حفاظت اور فہرست سازی کا شاید وہاں کسی نے اہتمام کیا ہو تو آج اس کی افادیت ظاہر ہے۔

اس زمانے میں کہ جب سیاسی عزائم کے تحت ہندوؤں میں اردو کے خلاف نفرت کے

جذبات عام ہو رہے تھے یا عام کیے جا رہے تھے اور ہندی کی حمایت میں خلاف حقیقت شواہد اور دلائل پر اصرار کیا جا رہا تھا، دتاسی نے اردو کی حمایت میں اپنے خیالات جس طرح اپنے مقدمے میں بیان کیے ہیں، اس سے اس کی غیر جانبداری، حقیقت پسندی اور میانہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے مذہب سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ وہ جن افراد کا تذکرہ کرتا ہے، اگر اسے ان کے مذہب کے بارے میں علم ہوتا ہے تو وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ان کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اگر ایسے افراد کا وہ ذکر کرتا ہے جنہوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا ہے، یعنی ہندو یا مسلمان سے عیسائی ہوئے ہوں یا ہندو، عیسائی و یہودی سے مسلمان ہوئے ہوں تو ایسے حوالے وہ بالعموم دیتا رہا ہے۔ ان حوالوں کے ذریعے کئی طرح کے مطالعات میں ان موضوعات کے ضمن میں بھی دتاسی کی اس کتاب سے مدد لی جاسکتی ہے۔

گاریس نے جہاں افراد کے بارے میں اپنی معلومات بیان کی ہیں وہیں ان افراد کی تحریر کردہ تصانیف کے بارے میں بتایا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ۔ اگر مطبوعہ ہیں تو کہاں سے یا کہاں کہاں سے چھپی ہیں اور ان کے کتنے ایڈیشن اس کے علم میں ہیں۔ اسی ذیل میں اس نے بالعموم مطالع کا بھی بالالتزام حوالہ دے دیا ہے جہاں سے کتاب چھپی ہے اور یہ بھی کہ اس مطبع کا مالک یا مہتمم کون ہے؟ اور یہ بھی مزید بتا دیا ہے کہ اس مطبع سے اگر کوئی اخبار چھپتا ہے تو کون سا اخبار چھپتا ہے اور اس کا مدیر کون ہے۔ اس لحاظ سے اگر مطالع اور اخبارات و جرائد کی کوئی فہرست مرتب کرنا ہو یا مطالع اور صحافت کی تاریخ مرتب کرنی ہو تو گاریس کی یہ تصنیف ایک ناگزیر ماخذ ہے۔

اس اہم تصنیف کا حال یہ ترجمہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود غیر مطبوعہ رہا ہے اور محض اس کا وہ مقدمہ، جسے مترجم نے تحریر کیا تھا، *Karachi University Studies* کے شمارے اگست ۱۹۶۶ء میں شائع ہو سکا تھا۔ جامعہ کراچی کے میرے مستقل یا باقاعدہ زمانہ طالب علمی (۱۹۶۵ء-۱۹۶۹ء) میں سننے میں آتا تھا کہ ڈاکٹر ابوللیٹ صدیقی اس کی اشاعت کے لیے ”مجلس ترقی ادب“ (لاہور) اور ”مرکزی اردو بورڈ“ (لاہور) سے کوشاں تھے، لیکن معلوم نہیں کیوں یہ اہم کتاب ان اداروں سے شائع نہ ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا متن، جو ناپ شدہ ہے، دست برد زمانہ اور بار بار حصولِ عکس کے (بذریعہ زیر و کس) عمل سے گزرنے کی وجہ سے مدہم ہو کر متعدد مقامات

پر پڑھنے میں دشوار ہو گیا ہے اور متعدد صفحات کا مکمل عکس بھی نہیں لیا جاسکا۔ پھر کہیں کہیں ناپ کرنے والے نے بھی بے نیازی برتی ہے، یہاں تک کہ الفاظ چھوڑ دیے ہیں اور جملے نامکمل بھی رہنے دیے ہیں۔ اشاعت کے لیے اس طرح کے متن کی تدوین اور کتابت خاص توجہ اور اہتمام کی متقاضی تھی جو شاید خودناشر کے لیے گوارا نہ تھی اور شاید اپنی مصروفیات کے سبب خود ڈاکٹریٹ صاحب کے لیے یہ نکتہ خواں طے کرنا ممکن نہ ہوا، جب کہ اس مقصد کے لیے اصل فرانسیسی متن سے ترجمہ شدہ متن کا مقابلہ ناگزیر بھی تھا تا کہ ناپ شدہ مسودے کی مذکورہ کمزوریوں کو دور کیا جاسکے۔

قریباً ۱۹۹۱ء کے آغاز میں شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر جمیل اختر خاں (۱۹۳۱ء-۲۰۰۰ء) نے شعبہ اردو کی صدارت کے دوران شعبے کے ایک تحقیقی مجلے کی اشاعت کا منصوبہ منظور کرایا تھا اور اس مقصد کے لیے راقم الحروف کو بھی ذمہ داری سونپی تھی، چنانچہ اس کے لیے مقالات کے حصول اور ان کی کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ خود راقم الحروف نے بھی اس مجلے کے لیے ملک اور بیرون ملک کے محققین سے مقالات حاصل کیے تھے۔ مرحوم نے کتاب خانہ محمود حسین جامعہ کراچی سے اس ترجمے کی دونوں جلدیں اس ارادے سے حاصل کی تھیں کہ یہ ترجمہ قسطوں میں اس مجلے میں شائع کر دیا جائے گا۔ اس کے ایک ابتدائی حصے کو کتابت کے لیے بھی دے دیا گیا لیکن نامعلوم وجوہات کے باعث نہ یہ مجلہ شائع ہوا نہ اس کے مقالات اور کتابت شدہ مواد کے بارے میں کچھ علم ہوا، کیونکہ راقم الحروف ایک طویل رخصت پر پہلے یورپ اور پھر جاپان چلا گیا اور یہاں کے حالات و معاملات سے لاتعلقی و بے خبر رہا۔ اس ترجمے کی دونوں جلدیں، جو مرحوم کی میز پر راقم الحروف نے بارہا دیکھی تھیں، بعد میں کہیں نظر نہ آئیں۔ محض اس کی ایک جلد، اقتباس لینے کے لیے صرف ایک دن کے لیے مرحوم نے اس کا عکس بنوانے کی خاطر میرے سپرد کی تھی جو عکس بنوانے کے بعد میں نے دوسرے ہی دن مرحوم کو لوٹا دی تھی۔ کاش دوسری جلد بھی مرحوم اسی طرح ایک دن کے لیے ہی سہی مرحمت فرما دیتے تو اس کا عکس بھی بنا کر محفوظ کر لیا جاتا۔ بعد میں یہ دونوں اصل جلدیں، ایک عرصے تک جہاں جہاں امکان ہو سکتا تھا وہاں بظاہر موجود اور دستیاب نہ ہوئیں، لیکن بالآخر دوسری جلد کا عکس بھی، جو ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کی ملکیت تھی، اس لائبریری کے ایک کرم فرما جناب

خالد حسین (پ: ۱۹۵۶ء) کی جستجو کے نتیجے میں مجھے دستیاب ہو گیا تو اس تاریخ کا مکمل ترجمہ شدہ متن پیش کرنا ممکن ہو گیا۔ چنانچہ میں نے جامعہ کراچی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی (پ: ۱۹۳۳ء) سے اس کی اشاعت کی اجازت کے لیے گزارش کی تو موصوف نے، جن کا اپنے منصب سے اخلاص، علم دوستی، نیکی و شائستگی اور دیانت کراچی یونیورسٹی کی تاریخ میں، ان کی نظامت کے بعد کے ادوار کے لیے ایک مثال ہے، بحیثیت شیخ الجامعہ کمال ذوق و شوق سے اجازت مرحمت فرمادی۔

جب اس ترجمے کو مبیہہ تیار کرنے کے لیے پڑھنا شروع کیا گیا تو اس کے مسودے کی مذکورہ کیفیت کی وجہ سے یہ کام آسان نہ تھا۔ خوش قسمتی سے راقم کے پاس گارسیں دتاسی کی متعدد کتابوں کے علاوہ اس تاریخ کی اولین اشاعت کی دونوں جلدیں عکسی صورت میں، جب کہ دوسرے ایڈیشن کی تینوں جلدیں اصل اور مکمل حالت میں موجود ہیں۔ چنانچہ مسودے کا، کتابت سے پہلے اور پروف خوانی کے مرحلے میں بار بار، اصل کتاب سے، جو بہت پُرانی ہونے کی وجہ سے خاصی خستہ اور بوسیدہ ہو چکی ہے اور کاغذ بھی زردی مائل ہو چکا تھا، مقابلہ خاصا دشوار ثابت ہوا، لیکن یہ مرحلہ بہر حال طے ہوا۔ پھر مترجم نے جہاں جہاں حواشی تحریر کیے تھے یا مصنف کی چھوڑی ہوئی معلومات میں اضافہ کیا تھا، انھیں مقالے کے ٹائپسٹ کی کوتاہیوں، مسودے کی خستگی، عکس و انعکس کی کوششوں کی وجہ سے متن کے قابل قراءت نہ رہنے کے باعث کاملاً نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے بڑی احتیاط کے ساتھ حالیہ ترتیب و کتابت کے وقت وہ حواشی مکمل یا ان کا نفس مضمون متن میں اس طرح شامل کر دیا گیا ہے کہ معلومات یا نفس مضمون متاثر نہ ہوں۔ اس طرح اس ترجمے کو معلومات کے لحاظ سے اصل فرانسیسی متن سے قدرے زیادہ مفید سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کام میں گارسیں دتاسی سے جہاں جہاں سہو ہوا ہے، یا معلومات غلط یا تشنہ رہی ہیں، ان میں سے کچھ کی نشان دہی قاضی عبدالودود (۱۸۹۳ء-۱۹۷۰ء) نے اپنے فاضلانہ اور محققانہ مذکورہ مقالات میں کردی تھی، کچھ کی نشان دہی خود مترجم نے ”تنقید و تحشیہ بر دیباچہ مصنف“ کے تحت اور متن میں متعدد مقامات پر کی ہے، یا آغا افتخار حسین (۱۹۲۱ء-۱۹۸۳ء) اور غلام حسین ذوالفقار (۱۹۲۳ء-۲۰۰۷ء) نے بھی اپنی مذکورہ کاوشوں میں اپنے زیر بحث موضوعات کے ذیل میں ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔

پھر دتاسی کا جو دیباچہ اس کتاب میں شامل ہے اس میں بیان کردہ گارسیں کے خیالات سے بعض مقامات پر بظاہر مترجم نے ”تنقید و تحشیہ“ کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس پر قوی گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس میں بیان کردہ معلومات اور ساتھ ہی اسلوب دراصل ڈاکٹر ابوالیث صدیقی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ متن میں بھی متعدد مقامات پر مترجم نے اشعار نقل کر کے ان کا استناد مذکوروں سے پیش کیا ہے، جسے مترجم کا اہتمام یا کاوش تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ مترجم نے متن کے ترجمے کے ساتھ ساتھ متعدد مقامات پر حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور کچھ اضافی اور تازہ معلومات بھی شامل کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ گارسیں کے متعدد بیانات پر تنقید اور ان کی تصحیح بھی کی ہے، جو تنہا ان کی کوشش معلوم نہیں ہوتی۔ پھر قلم اور تحریر کی پختگی بھی مظہر ہے کہ یہ سب مترجم کی کاوشیں نہیں ہو سکتیں۔

یہ ترجمہ اگرچہ دو جلدوں پر محیط تھا، لیکن افسوس ترجمے میں مترجم نے اختصار سے کام لیا اور مطالب اور مباحث کی تفصیلات کو حذف کر کے محض بنیادی معلومات تک ترجمے کو محدود رکھا ہے اور پھر ہندی زبان و ادب سے متعلق تمام موضوعات بھی حذف کر دیے، جو اصل کتاب کا ایک شریک حصہ تھے۔ اس طرح ہندی زبان و ادب سے متعلق متن کو خارج کر کے اس کتاب کے عنوان سے ہندوی کا لفظ بھی حذف کر دیا جس کا بظاہر جواز موجود تھا۔ واضح رہے کہ گارسیں دتاسی دیگر مستشرقین کی طرح اردو کے لیے بالعموم ”ہندوستانی“ کا لفظ استعمال کرتا رہا ہے لیکن اس نے اس زبان کے لیے جگہ جگہ ”اردو“ اور کہیں کہیں ”لشکری بولی“ اور ”ریختہ“ بھی استعمال کیا ہے۔

اس طرح کی کمزوریوں کے باوجود بحیثیت مجموعی یہ کہنے میں تامل نہیں کہ گارسیں دتاسی کی یہ تصنیف معلومات کا خزانہ ہے اور اپنے موضوعات کی حد تک جتنی معلومات شاعروں اور مصنفوں کے بارے میں گارسیں نے اس میں یکجا کر دی ہیں، اس تصنیف کے وقت تک کسی اور ماخذ میں، شعرا کے ضخیم سے ضخیم تذکروں کے بشمول، نظر نہیں آتیں۔ اگرچہ مصنف نے کسی مربوط تاریخ کے بجائے اس وقت تک کی عام روایت ”تذکرہ نویسی“ کے انداز میں اسے لکھا ہے لیکن اس کا تحریر کردہ طویل مقدمہ (پیش لفظ) اس انداز سے مختلف ہے۔ متن میں شعرا اور مصنفین کا تذکرہ اس نے حروف تہجی کی ترتیب سے کیا ہے اور ان سے متعلقہ تمام دستیاب معلومات کو وہاں جمع کر دیا ہے اور بالعموم اپنا ماخذ بھی

بتا دیا ہے کہ اسے اس شخص کے بارے میں معلومات کہاں سے ملی ہیں۔ اس طرح اب کسی شخص پر کوئی مزید کام کرنا چاہے تو دتاسی کی اس تصنیف میں درج نامزد کے توسط سے ایک رہنمائی آسانی سے میسر آسکتی ہے۔ بالعموم یہ نامزد ہم عصر نامزد ہیں اس لیے اور بھی اہم اور ناگزیر ہیں۔ یہ بھی ایک امتیاز اس تصنیف کا ہے کہ اس میں شامل ایک بہت بڑی تعداد ایسے شعرا و مصنفین کی ہے جن کے نام یا جن کے بارے میں معلومات نہ کسی تاریخ ادب میں اور نہ کسی تذکرے میں ملتی ہیں۔ اکثر افراد، کتابوں، مطبوعات اور مطالع کے بارے میں معلومات کے لیے یہ تصنیف واحد نامزد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے ہر طرح کے معیاری مطالعے اور استناد کے لیے یہ ہمیشہ ناگزیر رہے گی۔

اس تصنیف کی اہمیت اور کمیابی کے پیش نظر راقم نے اس کا واحد اردو ترجمہ از لیلیان سیکستین نازو برائے اشاعت مرتب کیا ہے، جو پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی کے زیر اہتمام زیر طبع ہے۔

## حواشی و حوالہ جات

- \* سابق ڈین، کلیہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔
- ۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے، جو فرانسیسی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، دتاسی کے نام کے لیے ”گارسس“ لفظ پر اصرار کیا ہے۔
- ۲۔ اس ضمن میں اس کے خیالات کے لیے خطبات گارسس دتاسی (اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء)، ص ۳۶-۳۹ و بعد۔
- ۳۔ ۱۷۹۳ء میں فرانس کے مغربی ساحلی شہر مارسلیو میں پیدا ہوئے ۱۸۱۷ء میں پیرس پہنچ کر اس وقت کے معروف مشرق سولہر و ساسی (Slivestre de Sacy) کی شاگردی اختیار کی اور فارسی، عربی، ترکی زبانیں سیکھیں۔ ۱۸۲۲ء میں اوارہ شرقیات (Societe Asiatica) کا مستند نامزد ہوا۔ اس عرصہ میں اسے اردو زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کے لیے اس نے انگلستان کا سفر کیا اور اردو دان انگریزوں سے یہ زبان سیکھی۔ واپس آکر ۱۸۳۸ء میں پیرس کے اہل شرقیہ کے اسکول میں اردو (ہندوستانی) کا استاد مقرر ہوا۔ پھر ساری عمر اسی حیثیت میں اردو تدریس و تحقیق میں منہمک رہے۔ ۱۸۷۸ء میں انتقال ہوا۔ تدفین جائے پیدائش مارسلیو ہی میں ہوئی۔
- ۴۔ اردو تذکرہ نویس پر جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں اس تذکرے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً: سید عبداللہ شاعر اردو کے تذکرے (لاہور، ۱۹۵۲ء)، ص ۶۲-۷۷؛ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (لاہور، ۱۹۷۲ء)؛ لیکن ان سے قطع نظر قاضی عبدالودود اور محمد محفوظ الحق کے مضامین مشمولہ گارسس دتاسی، از قاضی عبدالودود (پٹنہ، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۵۱-۱۸۳؛ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ”طبقات الشعراء ہند اور مولوی کریم الدین“ مشمولہ: صحیفہ (لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء)، ص ۳۷-۳۹؛ قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں۔

- ۵۔ ”تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی، جلد اول کی اشاعت اول“ مشمولہ قاضی عبدالودود تصنیف مذکور، ص ۲۳۹۔
- ۶۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ڈاکٹر آغا فقار حسین نے اس جلد کو ۲۳۶ صفحات پر مشتمل بتایا ہے۔ یورپ میں تحقیقی مطالعے (لاہور، ۱۹۶۷ء)، ص ۵۱۔
- ۷۔ قاضی عبدالودود تصنیف مذکور، ص ۳۹-۴۱۔
- ۸۔ اس کی تصانیف میں سے صرف ایک تصنیف کے انگریزی ترجمے کا علم ہوتا ہے *Memoire sur quelques particularities de la religion musulmane dans l'Inde d'apres les ouvrages hindoustani* جس سے ۱۸۳۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا موضوع ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد اور ان کی رسومات سے متعلق تھا۔ اس موضوع سے متعلق اپنی تصنیف سے قطع نظر گارسس دتاسی نے مسز میر حسن علی کی تصنیف *Observations on the Mussulmans of India* (مطبوعہ ۱۸۳۳ء) اور جعفر شریف کی تصنیف *Qanun-i-Islam* (مطبوعہ ۱۸۳۲ء) پر تبصرے لکھے تھے، جو پیرس کے تحقیقی مجلوں، علی الترتیب: *Journal Asiatique* (جن ۱۸۳۳ء) اور *Journal des Savants* (اگست، ستمبر ۱۸۳۳ء) میں شائع ہوئے۔ ان تینوں تصانیف کا ایک انگریزی ترجمہ ایم ویم نے ایک مجموعے کی صورت میں *Muslim Festivals in India and other essays* کے عنوان سے کیا، جو دہلی سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ مترجم نے اس ترجمے کو مفید بنانے کے لیے حواشی بھی تحریر کیں اور آغاز میں ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر گارسس دتاسی اور اس کی تصانیف کے تعلق سے مفید معلومات یکجا کیں۔ اس مترجم نے گارسس دتاسی کا اسی سلسلے میں ایک مقالہ، *Notice sur les fetes des Hindous*، اس نے ہندوؤں کے عقائد و رسومات کے تعارف میں تحریر کیا تھا، اور *Journal Asiatique* فروری اور مارچ ۱۸۳۳ء شائع ہوا تھا، انگریزی میں ترجمہ کیا اور جون ہی کے مرتبہ ایک مجموعہ مقالات *On becoming an Indian Muslim* مطبوعہ دہلی ۲۰۰۳ء میں بطور ضمیمہ *Notice on the fetes of Hindus according to Hindustani Works* کے عنوان سے شائع ہوا۔ ایم ویم کے علاوہ کمال لدانی نے حالیہ عرصے میں دتاسی کے بعض اہم مقالات کو، جو اس نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے لکھے تھے، اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے ترجمے بھی انگریزی میں کیے ہیں۔ دتاسی کا ایک مقالہ: *La Langue et la Litterature Hindoustanie*، جسے دتاسی نے ۱۸۷۴ء میں تحریر کیا تھا، ”Hindustani Language and Literature“ کے عنوان سے کیا، جو *Annual of Urdu Studies* کے شمارہ ۲۶، ص ۱۳۵-۱۶۶ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ دتاسی کی تصانیف: *Auteurs Hindoustanis et Levres Orange* اور *et Levres Orange Biographies Originale* کے ترجمے مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور ڈاکٹر ریاض الحسن نے کیے تھے، جن کا حوالہ سطور بالا میں آچکا ہے، کمال لدانی نے بھی ان کے ترجمے کیے ہیں جو *Annual of Urdu Studies* شمارہ ۲۸، ص ۶۶-۱۳۸ میں، بعنوان: *The Hindustani Authors and their Works as Described in the Primary Biographies*، شمارہ ۲۸، ص ۶۰-۱۳۸ میں شائع ہوئے ہیں۔
- ۹۔ ”فہرست کتب خانہ گارسس دتاسی“، مشمولہ: نوائے ادب (بمبئی)، جنوری، ۱۹۵۸ء؛ و نیز مشمولہ: قاضی عبدالودود گارسس دتاسی، محولہ بالا، ص ۱۱۵-۱۲۰۔ دتاسی کی تقریباً تمام تصانیف اب ”فریج نیشنل ڈیجیٹل لائبریری“ (French

(National Digital Library) کے اہتمام سے اس شیئ: <http://gallica.buff>، پر موجود اور قابل مطالعہ ہیں۔

## مآخذ

- دناسی، گارسیا۔ خطبات گارساں دناسی۔ اورنگ آباد ۱۹۳۵ء۔
- ذوالفقار غلام حسین۔ ”طبقات الشعراء ہند اور مولوی کریم الدین“۔ مشمولہ صحیفہ لاہور (جولائی ۱۹۶۷ء)۔
- حسین، آغا افتخار۔ بیورپ میں تحقیقی مطالعے۔ لاہور ۱۹۶۷ء۔
- عبداللہ سید۔ شعراے اردو کے تذکرے۔ لاہور ۱۹۵۲ء۔
- عبدالوہاب قاضی۔ گارساں دناسی۔ پٹنہ ۱۹۹۵ء۔
- \_\_\_\_\_۔ ”فہرست کتب خانہ گارساں دناسی“۔ مشمولہ نوائے ادب بمبئی (جنوری، ۱۹۵۸ء)۔
- فتح پوری، فرمان۔ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری۔ لاہور ۱۹۷۷ء۔